ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

خورشید ربانی❋

نوید صادق کی نظموں کا اجمالی جائزہ: وجودیت کے تناظر میں

A brief review of Naveed Sadiq's poems: In the context of existentialism

By *PhD Scholar, Dept. of Urdu, Qurtaba University, Dera Ghazi Khan, Campus.*

ABSTRACT

This study explores the poetry of Naveed Sadiq through the lens of existentialism, with emphasis on his collection *Dooraniyan*. His work reflects key existential concerns inner turmoil, self-discovery, and resistance to societal and traditional constraints. Through symbolic and dialogic imagery, his poems engage with themes such as the subjectivity of truth, the burden of freedom, and the individual's alienation from self and society. Poems like *Ek Aawaz Sun* and *Jis Mera Shehr Tha* illuminate his confrontation with existential solitude and the quest for authentic selfhood. Blending philosophical depth with poetic expression, Sadiq transforms his verse into an intellectual and experiential inquiry that prompts readers to question identity, existence, and meaning. This analysis demonstrates how his oeuvre resonates strongly with existential philosophy, weaving freedom, anxiety, and the search for meaning into the core of his poetic vision.

Keywords: Existentialism, Urdu Poetry, Selfhood and Identity, Freedom and Anxiety, Individual's alienation, Existential Solitude.

نوید صادق، معروف شاعر ہیں، ان کی غزلوں کا مجموعہ مسافت کے نام سے شائع ہوا۔ بعد ازاں ان کے تنقیدی مضامین ارتکاز کے نام سے سامنے آئے۔ علاوہ ازیں وہ سہ ماہی کارواں کے مدیر جبکہ ماہنامہ

❋ پی ایچ ڈی اسکالر، شعبۂ اردو، قرطبہ یونی ورسٹی، ڈیرہ غازی خان کیمپس

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

بیاض لاہور کی مجلس ادارت میں شامل ہیں۔گزشتہ سال ان کی نظموں کا مجموعہ دورانیہ کے نام سے شائع ہوا جبکہ امسال خالد علیم: شخصیت و فن کے نام سے بھی ان کی کتاب شائع ہوئی ہے۔ انھوں نے نامور شاعر نجیب احمد کا کلیات بھی مرتب کیا ہے۔نوید صادق کی نظموں میں فرد کی داخلی ہستی اور اس کی جدوجہد نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ رویہ دراصل جدید اردو نظم کے اس رجحان کی عکاسی کرتا ہے جس میں شاعر روایت سے بغاوت کرتے ہوئے اپنی انفرادی شناخت اور تخلیقی خودی کو مرکزیت دیتا ہے۔شاعر سمجھتا ہے کہ محض روایت کی پاسداری سے کام نہیں بنتا، اس لیے وہ اپنی آواز کے ذریعے ایک نئی دنیا، ایک نیا شعری امکان پیدا کرنے کی سعی کرتا ہے۔ وجودی تنہائی اور تخلیقی اضطراب، ایسے سوالات کو جنم دیتے ہیں جو انسانی فکر، اجتماعی شعور اور عصری حقیقتوں سے جڑے ہوئے ہیں۔

وجودی فلسفے کا ایک بنیادی نکتہ سچائی ہے۔ کیرکگارد سچائی کو صرف ایک معروضی (objective) حقیقت کے طور پر نہیں دیکھتا، بلکہ وہ اسے subjective truth یعنی ’’ذاتی سچائی‘‘ کے طور پر بیان کرتا ہے۔کیرکگارڈ کے نزدیک اصل سچائی اس وقت حاصل ہوتی ہے، جب فرد اس سچائی کو اپنی زندگی میں جذب کرلے، اس پر عمل کرے، اور اسے اپنی ذات کا حصہ بنالے۔ اس کے نزدیک مذہب اور ایمان کی سچائی بھی صرف اس وقت معنی رکھتی ہے، جب فرد اسے دل سے قبول کرے، نہ کہ صرف عقل یا خارجی دلائل کی بنیاد پر۔ اس تناظر میں نوید صادق کی ایک نظم کا یہ اقتباس دیکھیں:

ایک آواز سن
بین کرتی ہوئی ایک آواز سن
میرے برسوں بھٹکنے کی کاوش کا حاصل تو دیکھ
میرے پل پل بکھرنے، اجڑنے کا ثمرہ تو دیکھ
نفی و اثبات کی گفتگو چھوڑ دے
اپنے اندر چھڑی کشمکش کی طرف دھیان دے
اور بس
ایک آواز
بس ایک آواز کو میری دنیا سمجھ
کوئی ہے بھی نہیں

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کوئی تھا بھی نہیں
صرف ادراک تھا، صرف احساس تھا
کچھ روایت کی معجز بیانی چلی
کچھ رواجوں سے باغی کہانی چلی
اور میں آ گیا (ایک آواز سن) (۱)

اس نظم کا آغاز ہی ایک ایسی آواز سے ہوتا ہے، جس میں بین ہے، فریاد ہے:

ایک آواز سن
بین کرتی ہوئی ایک آواز سن

یہ آواز دراصل، شاعر کی ذات، شعور اور وجود کی گونج کی صورت، اس کے باطن سے ابھرتی ہے۔ وجودی فلسفے میں ایسے لمحات کو awakening کہا جاتا ہے، جہاں انسان پہلی بار اپنی ذات کے سوالات کا سامنا کرتا ہے:

میرے پل پل بکھرنے، اجڑنے کا ثمرہ تو دیکھ

یہاں شاعر بکھرنے، اجڑنے، اور بھٹکنے کو ایک منفی تجربہ نہیں بلکہ تخلیقِ ذات کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ وجودیت میں یہی تصور ملتا ہے کہ تکلیف اور انتشار، خودی کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ meaning through suffering کی ایک مثال ہے:

نفی و اثبات کی گفتگو چھوڑ دے
اپنے اندر چھڑی کش مکش کی طرف دھیان دے

یہاں شاعر منطقی فلسفے یا خارجی بحث و مباحثے کو بے معنی قرار دے کر داخلی صداقت کی طرف رجوع کرتا ہے۔ شاعر کی دنیا اب بیرونی حقیقتوں سے نہیں، بلکہ اس ''آواز'' یعنی اس کے داخلی شعور سے تشکیل پاتی ہے۔ یہاں مجید امجد کا مصرع:

اپنے پاس تو صرف اک آواز ہے

اور نوید صادق کا مصرع:

بس ایک آواز کو میری دنیا سمجھ

شناختِ ذات کے آئینہ دار بھی ہیں اور اسلوب کی انفرادیت کے ترجمان بھی۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

مجید امجد کے ہاں یہ احساس بہت گہرا ہے اور وہ ذات کی نفی سے یہ احساس دلاتا ہے کہ میں ہوں۔ان کی معروف نظم آٹو گراف سمیت کئی نظموں میں یہ احساس نمایاں ہے۔ان کا ایک شعر دیکھیں:

میں روز اِدھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے
میں جب اِدھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا (۲)

مجید امجد کی ایک نظم آواز کا امرت کی یہ لائنیں بھی توجہ طلب ہیں:

اپنے پاس تو صرف اک یہ آواز ہے، جس کے آگے کوئی بھی دیوار نہیں ہے
سَن سے تمھارے پاس پہنچ جاتی ہے
اس آواز میں رمزِ دروں کے سارے غیر مقطر زہر ہیں، اس کا برا نہ مانو
کبھی کبھی جی میں آئے تو سُن لو (۳)

وجودیت میں تنہائی، ایک گہرا فلسفیانہ اور ادبی تصور ہے جو وجودیت کے نظریات سے جڑا ہوا ہے۔ یہ احساس اس وقت جنم لیتا ہے جب انسان اپنے وجود، مقصد، اور کائنات میں اپنی حیثیت پر سوال اٹھاتا ہے۔ سارتر کہتے ہیں کہ ''انسان آزادی کے لیے مجبور ہے۔یعنی انسان مکمل طور پر آزاد ہے، لیکن یہ آزادی ایک بوجھ بن جاتی ہے، جو تنہائی کو جنم دیتی ہے۔ (۴)

تنہائی کا یہ احساس نوید صادق کی مذکورہ بالا نظم میں بھی جھلک دکھاتا ہے، ''کوئی ہے بھی نہیں، کوئی تھا بھی نہیں''، ''صرف ادراک تھا، صرف احساس تھا۔'' یہ سطریں وجودی تنہائی کا بیان ہیں۔ یہاں شاعر خدا، سماج یا کسی خارجی سہارے کی عدم موجودگی کو بیان کرتا ہے۔ یہ وہی کیفیت ہے جو سارتر یا کافکا کے کرداروں میں پائی جاتی ہے، تنہائی کا ادراک، اور اس تنہائی سے جنم لیتی آزادیاں اور ذمہ داریاں۔ یہاں روایت اور رواج کو دو متضاد قوتوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ شاعر اس معجز بیانی (یعنی جھوٹی تسلیوں یا مسلط شناخت) کو رد کرتا ہے اور ''بغاوت'' کا انتخاب کرتا ہے جو کہ وجودی فلسفے میں ''حقیقی خودی'' کے حصول کی علامت ہے۔ ''اور میں آ گیا۔'' یہ آخری سطر نظم کا وجودی نقطۂ عروج ہے۔ یہ محض کسی مقام پر پہنچنے کا اعلان نہیں، بلکہ انکشاف ذات ہے، اپنی بازیافت ہے۔ شاعر اب ایک نئے وجود کو دریافت کر چکا ہے، جو ادراک، تنہائی، اور بغاوت کے تجربات سے گزر کر اپنی آزادی اور شناخت کو پا چکا ہے۔ یہ نظم محض ذاتی اظہار نہیں بلکہ ایک فکری اور فلسفیانہ تجربہ ہے جو قاری کو وجود، خودی اور آزادی کے سوالات سے آشنا کرتا ہے۔ احساس تنہائی سے مملو ایک اور نظم بھی دیکھتے چلیے:

گھر میں ہنگامہ ہے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

شہر میں شور ہے
دشت میں کیا ملے کیا خبر!
اس سے آگے بھی اک مرحلہ جو ہم طے کیے جا رہے ہیں
اپنی تنہائی میں، اپنی پہنائی میں
دن کیے جا رہے ہیں
بس جیے جا رہے ہیں
...
آج تنہائی ہے
اپنی فرصت نہیں
کس سے باتیں کروں
کس کو سجدہ کروں
دھیان میں کپکپاتے ہوئے واہمے...
میرے ہونے سے نقصان ہے
وقت کا، ہست کا
سوچتا ہوں بہت
اور مرے شہر میں سوچنا منع ہے(۵)

یہ نظم جو مرا شہر تھا سے دو اقتباس ہیں، جن میں وجودی تنہائی کی وہ گہری کیفیت نمایاں ہے جس میں انسان نہ صرف دوسروں سے بلکہ اپنے آپ سے بھی کٹ چکا ہوتا ہے۔ شاعر ایک ایسے فرد کی نمائندگی کرتا ہے جو ''ہونے'' کے احساس کو نعمت نہیں، بوجھ سمجھتا ہے۔ ''کس سے باتیں کروں، کس کو سجدہ کروں'' جیسے مصرعے ظاہر کرتے ہیں کہ وہ نہ کسی انسانی ربط سے جڑا ہوا ہے، نہ کسی مابعدالطبیعیاتی حقیقت سے۔ وہ تنہا ہے مکمل طور پر، اور اس تنہائی کو صرف خاموشی یا فاصلہ نہیں بلکہ وجود کی بنیادوں سے علیحدگی کی صورت میں محسوس کرتا ہے۔ ''میرے ہونے سے نقصان ہے'' جیسے خیالات سارتر کے اس تصور کی بازگشت ہیں کہ انسان کو اپنی آزادی اور انتخاب کا مکمل بوجھ اٹھانا ہوتا ہے، اور یہی بوجھ اسے بے یقینی، تنہائی اور کبھی کبھار خود سے بیزاری میں دھکیل دیتا ہے۔ نظم کا اختتام ''اور مرے شہر میں سوچنا منع ہے،'' اس وجودی تنہائی پر سماجی جبر کی تہہ بھی چڑھاتا ہے، گویا ایک ایسا فرد جو سوال

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

اٹھاتا ہے، جو معنی تلاش کرتا ہے، وہ صرف تنہا نہیں، بلکہ خاموش بھی کروا دیا گیا ہے۔ دونوں شاعروں کا احساس جدا جدا ہے مگر بنیادی موضوع ایک ہی ہے یعنی شناخت کا بحران۔ تنہائی مجید امجد کے بھی تخلیقی تجربے میں شامل رہی ہے۔

میں اجنبی، میں بے نشاں
میں پا بہ گِل!
نہ رفعتِ مقام ہے، نہ شہرتِ دوام ہے
یہ لوحِ دل، یہ لوحِ دل
نہ اِس پہ کوئی نقش ہے، نہ اِس پہ کوئی نام ہے (۶)

مذکورہ بالا تینوں نظمیہ ٹکڑے تنہائی، وجودی خلا، اور شعور کی داخلی کیفیت کو مختلف زاویوں سے بیان کرتے ہیں۔ مجید امجد کی نظم میں شاعر خود کو بے نشان، بے مقام، اور بے نام محسوس کرتا ہے، گویا شناخت کا بحران اس کی ہستی کو کھا رہا ہے جبکہ نوید صادق کی نظم ایک حتمی داخلی سفر کی عکاسی کرتی ہے، جہاں سب کچھ تحلیل ہو کر صرف ایک ''آواز''، ایک ''ادراک'' اور ایک ''احساس'' میں سمٹ جاتا ہے۔ اسی طرح نوید صادق کی دوسری نظم میں شاعر بیرونی شور و ہنگامے سے بیزار ہو کر ایک ایسی زندگی گزار رہا ہے جو محض وقت کاٹنے جیسی ہے نہ کوئی سمت، نہ کوئی مقصد۔ یہ نظمیں بتدریج ایک ایسی فکری گہرائی میں لے جاتی ہیں جہاں مادی دنیا کا شور ماند پڑ جاتا ہے اور صرف شعور کی بازگشت باقی رہتی ہے۔

وجودیت کے مطابق انسان اپنی ''زندگی بخش حقیقت'' سے کٹا ہوا ہوتا ہے۔ یہ اصطلاح اُس بنیادی، گہرے تعلق کی طرف اشارہ کرتی ہے جو انسان کو اپنے وجود کی اصل سے، فطرت یا کائنات سے، خالق یا کسی مابعد الطبیعیاتی حقیقت سے، یا اپنے اندر کے سچے وجود سے جوڑتی ہے۔ وجودی فلسفے میں یہ مانا جاتا ہے کہ انسان ان تمام جہتوں سے کٹ چکا ہے یا کٹنے کا احساس رکھتا ہے۔ ٹیکنالوجی، سماجی ڈھانچے، اور اقدار کی تبدیلی نے انسان کو اُس فطری یا روحانی حقیقت سے دور کر دیا ہے۔ انسان واحد مخلوق ہے جو اپنے وجود پر سوال اٹھاتا ہے، ''میں کون ہوں؟''، ''کیوں ہوں؟''، ''کیا میری زندگی کا کوئی مقصد ہے؟'' کچھ وجودی مفکرین، کہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی واضح ''آسمانی آواز'' یا رہنمائی نہیں، اس لیے انسان خود ہی راستہ بناتا ہے۔

نوید صادق کا اظہارِ خیال ملاحظہ ہو:

جانتے ہو؟

ISSN: 2519-6332 (Print),   ISSN: 2708-1915 (Online)

اُدھر شہر میں آج بھی کوئی ہے
جس کی آنکھوں کی چنگاریاں
کھینچتی ہیں بہت
لیکن اب
لیکن اب فاصلے بڑھ گئے ہیں بہت
اور میں تھک گیا ہے

اس ضمن میں مجید امجد کا فکری زاویہ دیکھیں:

یہ محلے، یہ منڈیریں، یہ محل، یہ منڈلیاں
کون دیکھے اب یہاں
کھنچ گئی ہیں کتنی دیواریں دلوں کے درمیاں
بھر لیے ہم نے ان ایوانوں میں تھے جتنے شگاف
کون دیکھے آسماں کی چھت میں ہیں کتنے شگاف(۸)

ان سطور میں ایک گہرا انسانی تجربہ جھلکتا ہے یعنی تعلقات، وقت، اور جدائی کے احساس کے باوجود زندگی کا تسلسل۔ شاعر اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ ماضی میں کوئی ایسا تھا جس کی آنکھوں کی چمک دل کو کھینچتی تھی، یعنی زندگی میں کبھی جذبات، کشش اور وابستگی کی روشنی موجود تھی۔ لیکن اب، وقت اور فاصلے نے اس تعلق کو کمزور کر دیا ہے، اور شاعر جذباتی طور پر خود کو زندگی بخش حقیقت سے دور محسوس کرتا ہے۔ ایک اور نظم کا یہ ٹکڑا بھی توجہ طلب ہے:

مجھے دیکھو
مرے کاندھوں پہ رکھی چارپائی ہل رہی ہے
مگر ٹھہرو!
مرے کاندھے ابھی تہذیب کے ورثے سے خائف ہیں
مگر یہ چارپائی چھت ہے جس نے ہر گھڑی سایا کیا ہے
مگر چالیس سالوں میں تو کوئی تھک نہیں جاتا
مرے دادا نے اپنی موت سے کچھ روز

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

پہلے یہ کہا تھا
''ارے بیٹا! میں بوڑھا تو نہیں جو تھک کے
گھر میں بیٹھ جاؤں...!
مگر میں تھک گیا ہوں''[۹]

یہاں یہ احساس نمایاں ہے کہ انسان اپنی اصل، فطری احساسات، اور سچے انسانی رشتوں سے دور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جب انسان محض سماجی توقعات، روایتی ذمے داریوں یا معاشی دوڑ میں الجھ کر جیتا ہے تو وہ جینے کے بجائے صرف نباہ رہا ہوتا ہے۔ جذبات کو دبانا، تھکن کو نظر انداز کرنا، اور خود کو ہمیشہ ''مضبوط'' ثابت کرنا دراصل اُس فطری زندگی سے دوری ہے جو احساس، کمزوری، محبت اور سکون کی بنیاد پر قائم ہے۔ ایسی زندگی بتدریج انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے، جہاں صرف ظاہری بقا باقی رہتی ہے، مگر زندگی کا اصل لطف، تعلق، اور معنویت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کٹاؤ کو پہچاننا اور اس کے خلاف کھڑا ہونا ہی زندگی کی طرف واپسی کا پہلا قدم ہے۔ اس صورتحال میں ہائیڈیگر انسانی وجود (Dasein) کے اس بحران کو بیان کرتا ہے جہاں شخص اپنی انفرادیت سے ہٹ کر یعنی معاشرتی بھیڑ میں کھو جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے ''کہ ارادہ تو ہوتا ہے، مگر عمل کی راہ میں وہی معاشرتی سانچے رکاوٹ بن جاتے ہیں۔''[۱۰]

نوید صادق اس صورتحال کو ایک بلیغ استعارے کے ساتھ یوں پیش کرتا ہے:

گملے میں مرجھاتے پھولوں کے چہروں کو دیکھا ہے
صبح سویرے یہ بے چارے پانی چاہتے ہیں
اچھا میں کچھ کرتا ہوں
لیکن میرے ہاتھ اور پاؤں
جیسے کسی نے باندھ دیے ہوں
اپنے سہارے بوجھل بوجھل گلیوں میں
صبح سویرے کوئی کہاں تک جا سکتا ہے[۱۱]

''گملے میں مرجھاتے پھولوں کے چہروں کو دیکھا ہے''، پھول صرف نباتات نہیں، یہ یہاں انسانی وجود کا استعارہ بن گئے ہیں، ایسا وجود جو ماحولیاتی اور روحانی طور پر بنجر ہو چکا ہے۔ ''صبح سویرے یہ بے چارے پانی چاہتے ہیں''، پانی یہاں صرف ایک جسمانی ضرورت نہیں، بلکہ معنی، مقصد، روحانی غذا کی علامت ہے، وہ چیز جس

کے بغیر وجود مرجھا جاتا ہے۔ وجودی انسان بھی یہی کہتا ہے۔

اچھا میں کچھ کرتا ہوں
لیکن میرے ہاتھ اور پاؤں
جیسے کسی نے باندھ دیے ہوں

یہی وہ لمحہ ہے جہاں وجودی تضاد سامنے آتا ہے، فرد جانتا ہے کہ کچھ کرنا چاہیے، وہ شعور رکھتا ہے، مگر عمل کی سکت نہیں رکھتا۔ یہ وہی کیفیت ہے جو ہائیڈیگر یا کافکا کے کرداروں میں ملتی ہے جہاں ارادہ موجود ہے مگر دنیا یا ذات کی رکاوٹیں عمل سے روکتی ہیں۔ فلسفۂ وجودیت کے مطابق انسان اکیلا، بوجھ تلے دبا ہوا اور اپنی راہ تلاش کرنے میں اکثر ناکام ہوتا ہے۔ یہ ''گلیاں'' صرف راستے نہیں بلکہ زندگی کے امکانات کی راہیں ہیں، جن میں انسان بمشکل چل پاتا ہے۔ نظم کا یہ ٹکڑا ایک وجودی انسان کی مکمل صورت گری کرتا ہے جو اپنی زندگی کی ابتدائی سطح پر ہی ایک ایسی کمی، ایک ایسی خالی جگہ، یا ایسی پیاس کا سامنا کرتا ہے جو بظاہر معمولی ہے مگر دراصل معنی کی تلاش ہے۔ نوید صادق کی نظم سب ریت ہے ملاحظہ ہو:

سونے والوں سے کوئی نہیں پوچھتا
اور پوچھے بھی کیوں
زیست میں چند لمحے فراوانی کی ریت میں بہہ گئے
کوئی ڈھونڈے کہاں
کیا خبر رات ہم کس طلب کے کنویں میں پڑے تھے
اور کنویں میں سنا ہے کہ پہلے پہل صرف پانی تھا

اب

ریت ہے

... ریت ہی ریت ہے! (۱۱)

مجید امجد نے بھی 'ریت' کی علامت کو برتا ہے، ان کا اندازِ بیاں دیکھیں:

سب کچھ ریت... سرکتی ریت
ریت کہ جس کی ابھی ابھی قائم اور ابھی ابھی مسمار تہیں... تقدیروں کے پلٹاوے ہیں
جل تھل... اتھل پتھل سب... سب جیسے ریت کی سطحوں پر کچھ مٹتی سلوٹیں

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کیسی ہے یہ بھوری اور بھسمنت اور بھر بھری ریت
جس کے ذرا ذرا سے ہر ذرے میں پہاڑوں کا دل ہے
ابھی ابھی ان ذروں میں اک دھڑکن تڑپی تھی
ابھی ابھی اک سلطنت ڈوبی ہے
ابھی ابھی ریتوں کی سلوٹوں کا ایک کنگرہ ٹوٹا ہے
سب کچھ ریت... سرکتی ریت (۱۲)

دونوں نظموں میں ''ریت'' ایک مرکزی استعارہ کے طور پر ابھرتی ہے، مگر دونوں کی فکری سطح، جذباتی شدت، اور معنوی دائرہ مختلف ہے۔ مجید امجد کی نظم ایک وسیع تر کائناتی اور تہذیبی تناظر میں ریت کو استعارہ بناتی ہے، جہاں ریت تاریخ، سلطنتوں، پہاڑوں اور تقدیروں کے انہدام کی علامت ہے۔ یہاں لہجہ متحرک اور علامتی ہے، جیسے شاعر کسی بڑی تباہی کا گواہ ہو۔ نوید صادق کی نظم ایک داخلی، انفرادی اور جذباتی کرب کا اظہار ہے جہاں ریت وقت، لاچاری اور کھوئی ہوئی طلب کی علامت بن کر ابھرتی ہے؛ کنویں میں پہلے پانی تھا، ایک زندگی بخش حقیقت، جو اب ریت میں بدل چکی ہے، یعنی امید کا زوال۔ مجید امجد کی نظم بلند آہنگ جبکہ نوید صادق کی نظم دھیمے انداز کی حامل ہے۔ نوید صادق کے یہاں ''نیند''، ''کنواں''، ''پانی'' اور آخر میں ''ریت'' جیسی علامتوں کے ذریعے انسان کی طلب، ناکامی، تنہائی اور معنویت کے زوال کو بیان کیا گیا ہے۔ نظم مختصر ہے، مگر اپنے اندر ایک وجودی خلا کی پوری شدت رکھتی ہے۔

سونے والوں سے کوئی نہیں پوچھتا
اور پوچھے بھی کیوں

یہاں ''سونے والے'' صرف جسمانی نیند میں نہیں بلکہ روحانی غفلت یا سماجی لاتعلقی میں گم افراد ہیں۔ یہ سونا دراصل وجودی بے حسی یا absurd دنیا سے فرار ہے۔ وجودیت کے مطابق، معاشرہ صرف بیدار، فعال اور فائدہ مند افراد کو اہمیت دیتا ہے، جبکہ تھکے ہوئے، بے سمت یا سوال کرنے والے افراد کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔ یہی بات شاعر تلخی اور طنز کے ساتھ کہتا ہے، ''پوچھے بھی کیوں؟''

زیست میں چند لمحے فراوانی کی ریت میں بہہ گئے
کوئی ڈھونڈے کہاں

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

یہاں زندگی کے وہ نایاب لمحے جن میں کچھ پانے یا جینے کی توقع تھی، وہ بھی ریت کی مانند بہہ گئے یعنی پھسل گئے، گرفت میں نہ آسکے۔ ریت ایک انتہائی طاقتور وجودی استعارہ ہے یہ نہ پانی کی طرح زندگی بخش ہے، نہ زمین کی طرح ٹھوس۔ یہاں سارتر کا وہ خیال یاد آتا ہے کہ ''زندگی کی کوئی واضح ساخت نہیں، ہم خود اس کو بنا رہے ہوتے ہیں اور اکثر دیر ہو جاتی ہے''۔

کیا خبر رات ہم کس طلب کے کنویں میں پڑے تھے

یہ ایک شاندار، وجودی سطر ہے۔ ''طلب کا کنواں'' دراصل معنویت، محبت، یقین، یا خدا کی تلاش کا کنواں ہے۔ شاعر اعتراف کرتا ہے کہ وہ نہیں جانتا اس لاعلمی میں ایک ''وجودی بے یقینی'' ہے۔ اور کنویں میں سنا ہے کہ:

پہلے پہل صرف پانی تھا

اب ریت ہے

ریت ہی ریت ہے!

یہاں کنواں جو کبھی زندگی بخش پانی سے بھرا تھا، اب ریت سے بھر چکا ہے یعنی اب زندگی میں کوئی اصل، کوئی مقصد، کوئی ''روحانی مرکز'' باقی نہیں۔ ''سب ریت ہے'' کہنا گویا کل وجود کی بے معنویت کا اعلان ہے۔ یہ نظم ایک جدید انسان کی داخلی چیخ ہے جو طلب، امید، اور معنویت کے کنویں میں جھانکتا ہے، مگر وہاں اسے کچھ نہیں ملتا صرف ریت۔ یہ صرف ایک عام تجربہ نہیں بلکہ ایک فلسفیانہ تجربہ ہے، وہ لمحہ جب انسان کو یقین ہو جائے کہ دنیا کسی سچائی، کسی مرکز، یا کسی مقصد پر قائم نہیں، صرف بکھری ہوئی، بے شکل، بے سمت ریت ہے۔ یہی لمحہ وجودیت کے مطابق، ایک ''بیداری'' (awakening) ہے۔ مگر یہ بیداری تکلیف دہ ہے، کیوں کہ یہ انسان کو مکمل اکیلا، ذمے دار، اور غیر محفوظ چھوڑ دیتی ہے۔ وجودیت کی بنیاد ہے میں یہ فکر بھی موجزن ہے کہ ''جینا صرف سانس لینا نہیں، بلکہ شعور کے ساتھ ہر سانس کا مطلب تلاش کرنا ہے۔''(۱۳)

نوید صادق کی نظم سے یہ اقتباس دیکھیں:

گھر میں صحن ہے؟

صحن میں گھر ہے؟

اندازے بہکاتے ہیں

اندیشے نذر گزارتے ہیں

ہم وقت گزارتے جاتے ہیں

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

زندہ ہو؟
کیا تم سارے زندہ ہو
اس عالم میں جس دم
دھوپ بدن کو چھیدتی ہے
تم قدریں ماپتے پھرتے ہو
الٹی سیدھی، کچی پکی قدریں
جن کی بنیادوں میں خام خیالی، رام دوالی بیٹھے ہیں (۱۴)

نوید صادق کی نظم کا یہ ٹکڑا ایک اور وجودیاتی تجربے کی نہایت فکری اور علامتی ترجمانی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے سوال، شک، بے یقینی، اقدار کا زوال، اور وجودی اضطراب جیسے موضوعات کو گہرے استعاروں میں بیان کیا ہے۔یہ نظم وجودیت کے بنیادی سوالات کو لمس کرتی ہے میں کہاں ہوں؟ میں کیا ہوں؟ زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ قدریں حقیقت ہیں یا فریب؟ کیا ہم زندہ ہیں، یا محض سانس لے رہے ہیں؟

گھر میں صحن ہے؟
صحن میں گھر ہے؟

یہ سطریں نظم کے وجودیاتی سوالات کی بنیاد رکھتی ہیں۔شاعر کسی خارجی شے کی بات نہیں کر رہا، بلکہ وجود کی ساخت اور تشکیل پر سوال اٹھا رہا ہے۔یہ سوال ہمیں ژاں پال سارتر یا ہائیڈیگر کی فکر کی طرف لے جاتا ہے، جہاں فرد خود اپنے وجود کو تشکیل دیتا ہے مگر ابتدا میں وہ خود بھی اپنے مقام اور حیثیت سے ناواقف ہوتا ہے۔یہاں ''گھر'' اور ''صحن'' کی جگہ بدلنے سے شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہم وجود اور فہم کے درمیان پھنسے ہوئے ہیں۔ہم یہ نہیں جانتے کہ حقیقت کہاں ہے اندر یا باہر؟ ہمارے دل میں یا ہمارے آس پاس؟

اندازے بہکاتے ہیں
اندیشے نذر گزارتے ہیں

وجودیت میں شک اور بے یقینی بنیادی حالتیں ہیں۔ یہاں شاعر کہتا ہے کہ ہمارے سارے اندازے (یعنی علم، منطق، عقیدے) ہمیں دھوکہ دے سکتے ہیں۔''اندیشے نذر گزارنا'' ایک گہرا استعارہ ہے گویا خوف، وسوسے، اور الجھنیں ہم پر مسلط ہو چکی ہیں۔''ہم وقت گزارتے جاتے ہیں''، یہ جملہ مکمل وجودی تھکن اور خلا کی نشاندہی کرتا ہے۔ہم جیتے نہیں، محض وقت گزارتے ہیں۔یہ البیر کامو کے تصور absurdity کی یاد دلاتا ہے کہ

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

انسان وقت کے صحرا میں، کسی حتمی مقصد کے بغیر، روزمرہ کے معمولات میں کھویا ہوا ہے۔

زندہ ہو؟

کیا تم سارے زندہ ہو؟

یہ صرف جسمانی حیات کا سوال نہیں، بلکہ ادراک، شعور، اور مقصد کا سوال ہے کیا تم واقعی زندہ ہو؟ یا محض چلتے پھرتے سانس لیتے مجسمے ہو؟ یہی سوال سارتر اور کافکا جیسے مفکرین اور ادیبوں نے بار بار اٹھایا کہ زندگی، جب تک وہ شعوری اور آزادانہ طور پر نہ گزاری جائے محض بایولوجیکل حرکت ہے۔

اس عالم میں جس دم

دھوپ بدن کو چھیدتی ہے

یہاں ''دھوپ'' صرف موسمی یا طبعی شے نہیں، بلکہ زندگی کی بے رحم حقیقت، تکلیف، یا روشنی کا وہ لمحہ ہے جب انسان حقیقت سے ٹکراتا ہے۔ ''دھوپ بدن کو چھیدتی ہے''، یعنی وجودی تجربہ تکلیف دہ ہے، لیکن یہی تکلیف ادراک کو جنم دیتی ہے۔

تم قدریں ماپتے پھرتے ہو

الٹی سیدھی، کچی پکی قدریں

یہ سطور اخلاقی اور سماجی اقدار کی ساخت پر شدید طنز ہیں۔ وجودیت کے مطابق، اقدار فطری یا آسمانی نہیں بلکہ انسان کے بنائے ہوئے ڈھانچے ہیں، اور جب یہ ڈھانچے کھوکھلے ہو جائیں تو انسان خود بے وزن ہو جاتا ہے۔

جن کی بنیادوں میں خام خیالی، رام دوالی بیٹھے ہیں

یہ سطر براہِ راست مذہبی، ثقافتی، یا روایت پر مبنی اقدار کی حقیقت پر سوال اٹھاتی ہے۔ ''خام خیالی'' اور ''رام دوالی'' دونوں مذہبی، ثقافتی پیکر ہیں، مگر شاعر کا لہجہ ان میں ایک بے یقینی، یا طنز کا رنگ رکھتا ہے۔ یہاں شاعر اس بات پر توجہ دلانا چاہتا ہے کہ ہم جن اقدار کو مقدس سمجھتے ہیں، ان کی بنیادیں خیال، مفروضہ، یا خوف پر قائم ہیں اور ہم انھیں آنکھیں بند کر کے قبول کر لیتے ہیں۔ یہ نظم سوال، بے یقینی، اقدار کے کھوکھلے پن، اور وجود کی بے معنویت کا مکمل اظہار ہے۔ یہ قاری کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کرتی ہے جہاں وہ خود سے پوچھے میں کہاں ہوں؟ جو کچھ میں مانتا ہوں، وہ واقعی سچ ہے؟ کیا میں زندہ ہوں یا صرف چل رہا ہوں؟ میری زندگی کے ستون کن بنیادوں پر کھڑے ہیں؟ سوالات ہیں جو وجودی فکر کو جنم دیتے ہیں اور یہی اس نظم کی روح ہے۔

اس مختصر تجزیہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ نوید صادق کی نظموں میں وجودیت کی گہری عکاسی ملتی

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

ہے، جہاں انسان کی داخلی بے چینی، خودی کی تلاش، اور معنویت کے زوال جیسے موضوعات نمایاں ہیں۔ ان کے ہاں سوالات کا تسلسل، شعور اور لاشعور کے درمیان مکالمہ، اور اقدار کے کھوکھلے پن پر طنز اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ شاعر محض خارجی دنیا کا مشاہدہ نہیں کر رہا، بلکہ اپنے وجود کی تہہ میں جھانک رہا ہے۔ زندگی، وقت، اور شناخت جیسے مضامین ان کی نظموں میں ایسے ابھرتے ہیں کہ قاری ایک فکری بحران کا سامنا کرتا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے وجودی فلسفہ فرد کو اپنے مقابل لا کھڑا کرتا ہے۔ ان کا اسلوب علامتی، مکالماتی اور فکری سطح پر متحرک ہے، جو ان کی نظموں کو محض جمالیاتی اظہار نہیں بلکہ فکری تجربہ بنا دیتا ہے۔

حواشی

۱۔ نوید صادق، دورانیہ، (لاہور: کارواں پبلشرز، ۲۰۲۴ء)، ص ۷۸
۲۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد، مرتبہ خواجہ محمد زکریا، (لاہور: ماورا پبلی کیشن، ۱۹۸۹ء)، ص ۴۴۶
۳۔ ایضاً، ص ۱۸۷
۴۔ ژاں پال سارتر (Jean-Paul Sartre)، *Existentialism is a Humanism*، (نیوہیون: ییل یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۲۵
۵۔ نوید صادق، دورانیہ، ص ۱۲۱، ۱۲۴
۶۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد، ص ۱۸۷
۷۔ نوید صادق، دورانیہ، ص ۶۲
۸۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد، ص ۳۶۰
۹۔ نوید صادق، دورانیہ، ص ۹۲
۱۰۔ مارٹن ہائیڈیگر (Martin Heidegger)، Being and Time، (نیویارک: ہارپر اینڈ رو، ۱۹۶۲ء)، ص ۱۷۳
۱۱۔ نوید صادق، دورانیہ، ص ۵۹
۱۲۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد، ص ۶۲۰
۱۳۔ ژاں پال سارتر (Jean-Paul Sartre)، *Being and Nothingness*، (نیویارک: واشنگٹن اسکوائر پریس، ۲۰۰۷ء)، ص ۷۸
۱۴۔ نوید صادق، دورانیہ، ص ۴۰

مآخذ

۱۔ امجد، مجید، کلیاتِ مجید امجد، مرتبہ خواجہ محمد زکریا، لاہور: ماورا پبلی کیشن، ۱۹۸۹ء
۲۔ سارتر، ژاں پال (Sartre, Jean-Paul Sartre)، *Existentialism is a Humanism*، نیوہیون: ییل یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۷ء
۳۔ ____، *Being and Nothingness*، نیویارک: واشنگٹن اسکوائر پریس، ۲۰۰۷ء
۴۔ صادق، نوید، دورانیہ، لاہور: کارواں پبلشرز، ۲۰۲۴ء
۵۔ ہائیڈیگر، مارٹن (Heidegger, Martin)، Being and Time، نیویارک: ہارپر اینڈ رو، ۱۹۶۲ء

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

Bibliography:

1. Amjad, Majeed, *Kulliyat-e Majeed Amjad*, Ed. by Khwaja Muhammad Zakariya, Lahore: Mawra Publications, 1989.
2. Sartre, Jean-Paul, *Existentialism Is a Humanism,* New Haven: Yale University Press, 2007.
3. ____, *Being and Nothingness,* New York: Washington Square Press, 2007.
4. Sadiq, Naveed, *Doraniyah,* Lahore: Karwan Publishers, 2024.
5. Heidegger, Martin, *Being and Time,* New York: Harper & Row, 1962.